شہدائے کربلا کے قریب بتائی جاتی ہے۔ اس دہشت گردی کی سنگینی اور شدت نے سرکاری اداروں اور میڈیا کو شہیدوں کی اصل تعداد کا عشر عشیر ہی رٹنے پر مجبور کر دیا۔ صحافتی زبان میں میڈیا ''خواہش'' کو ''خبر'' بناتا رہا۔ لیکن ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں، بشرطیکہ اس کے پیچھے اسلام اور پاکستان کے ازلی دشمنوں کے بھیانک مقاصد کو خاک میں ملانے کا سچا جذبہ کارفرما ہو۔

بعض سیاسی عناصر اس پاکیزہ جذبے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی لیڈری چمکانے اور حکومت کو دہشت گردوں کے سر پر دستِ شفقت رکھنے پر مجبور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کوشش یقیناً اسلام دشمن عناصر کو تقویت دینے اور دہشت گردی کی حوصلہ افزائی ہونے کے ناطے ناقابل معافی ہے۔

حکومت پاکستان نے اس خونچکاں واقعے کے ردعمل میں کئی اقدامات اٹھائے: شہیدوں کی تعداد کم دکھلانا، ''مجرموں کو پکڑ کر کیفر کردار تک پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑنے'' کا اعلان، (اس اعلان کو کسی بھی قیمت پر ''بوگس'' ثابت نہیں ہونا چاہیے)، ''تحقیقاتی کمیشن کی تشکیل''، ''بین المذاہب قومی ہم آہنگی کمیشن'' کا قیام وغیرہ۔ پوری مسلم قوم کی دعا اور تمنا ہے کہ ''اقدامات'' کی یہ ''کثرت'' وطن عزیز سے فرقہ وارانہ دہشت گردی کے خاتمے میں مفید ثابت ہو۔ یقیناً ''امن وامان'' ہر زندہ انسان کی ضرورت ہے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی عمر، رنگ، نسل، زبان اور فرقے سے ہو۔

دراصل دہشت گردی کا قلع قمع کرنے والا ''جاندار اقدام'' صرف یہ ہے کہ: دہشت گردوں کو جلد از جلد قانون کے مطابق سخت سزا دی جائے۔ اس بات کا یقینی انتظام کیا جائے کہ اسلام دشمن عناصر کے ہاتھوں بکنے والا یا بطور کھلونا استعمال ہونے والا کوئی بھی دہشت گرد رہا ہونے نہ پائے۔ نیز آئندہ ہر قسم کی فرقہ وارانہ عبادت کو اپنے اپنے عبادت خانوں کی چار دیواری تک محدود رکھا جائے۔

دہشت گردوں کے سروں پر دستِ شفقت رکھنے سے دین وملت کے ازلی دشمنوں کے گھروں میں گھی کے چراغ جلیں گے، جو نہ صرف اسلامی جمہوریہ پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام میں اتفاق واتحاد، امن وامان اور مذہبی رواداری کو جلا کر بھسم کر دیں گے۔

اللہ تعالیٰ مسلمان حکمرانوں، علماء، قائدین اور عوام سب کو سمجھ عطا فرمائے اور فرقہ پرستوں کو دشمنانِ دین کے ہاتھوں کھلونا بننے سے محفوظ رکھے۔ آمین

درسِ قرآن پاک

تراث رحمانی در فوائد قرآنی

ڈاکٹر محمد اسماعیل امین

﴿وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ○ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلاً غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ○﴾[البقرة ۵۸-۵۹]

ترجمہ: ''اور جب ہم نے حکم دیا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ، پس اس میں سے حسبِ منشا کھاؤ جہاں سے چاہو، اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور ﴿حِطَّةٌ﴾ ''بخش دے'' کہتے جاؤ تو ہم تمہیں تمہاری خطائیں بخش دیں گے، اور ہم نیکی کرنے والوں کو جلد ہی زیادہ عطا فرمائیں گے۔ پھر ان ظالموں نے اس قول کی جگہ' جو ان سے کہا گیا تھا' ایک دوسرا قول بدل دیا۔ پس ہم نے ان ظالموں پر ان کے فسق و نافرمانی کے سبب آسمان سے عذاب اتار دیا۔''

سابقہ آیات سے ربط اور مختصر تفسیر

سابقہ آیات میں اللہ سبحانہ نے بنی اسرائیل پر میدانِ تیہ میں کی ہوئی چند نعمتوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے ان کی نافرمانیوں کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے میدانِ تیہ میں چالیس سال کا طویل عرصہ گزارا۔ اسی دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی وفات پا چکے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں بنی اسرائیل اپنے بزدلانہ رویے کی وجہ سے جہاد سے انکار کرتے رہے۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد انہوں نے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں کفار سے جہاد فی سبیل اللہ کیا اور بیت المقدس فتح ہو گیا۔

زیرِ تفسیر آیات میں اللہ پاک نے جہاد فی سبیل اللہ کی بدولت فتح و نصرت اور ان کے مقدس شہر (بیت المقدس) پر دوبارہ قبضہ کرانے اور میدان تیہ میں بھٹکتے پھرنے کی ذلت آمیز سزا سے نجات جیسے بڑے بڑے انعامات کے شکرانے میں انہیں حکم دیا کہ جب شہر کے دروازے پر پہنچیں تو سجدہ کرتے ہوئے داخل ہوں اور ﴿حِطَّةٌ﴾ کہتے جائیں، یعنی ''اے اللہ! ہمارے گناہ معاف فرما''، لیکن ان ظالموں نے سرکشی کی اور سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے اور ﴿حِطَّةٌ﴾ کے بجائے

''حَبَّةٌ فی شَعْرَةٍ'' کہتے ہوئے داخل ہوئے۔ چونکہ اس میں اللہ پاک کے حکم کی انتہائی اہانت تھی، اس لیے انہیں بڑے عذاب میں مبتلا کر دیا گیا۔[ابن کثیر، تفسیر لقمان]

ارشاد فرمایا: ﴿واذ قلنا ادخلوا هذه القريةَ﴾ ادخلوا: شیخ ابن العثیمینؒ فرماتے ہیں: یہ امر شرعی ہے؛ کیونکہ انہیں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونے کا ''حکم'' دیا گیا تھا۔ اور وہ امر کونی کے ساتھ داخل ہوئے' تو یہ امر کونی بھی ہوا۔

﴿ادخلوا﴾ میں ﴿اسکنوا﴾ یعنی ''سکونت اختیار کرو'' کے معنی بھی شامل ہیں؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ﴾[الأعراف ١١٦]

﴿الْقَرْيَة﴾ آباد شہر کو کہا جاتا ہے۔ اور یہ قري سے مشتق ہے، جو ''جمع ہونے'' کے معنی میں آتا ہے۔ اسی سے تالاب المِقْرَاۃ کہلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: قريتُ الماءَ فی الحوضِ ''میں نے حوض میں پانی جمع کیا۔''

﴿القرية﴾ عرب کے عرف میں گاؤں اور بستی کو کہتے ہیں، جبکہ قرآنی لغت میں ''مکہ مکرمہ'' پر بھی اطلاق ہوا ہے، جو اُس دور میں بھی ''شہر'' تھا۔ ارشاد الٰہی ہے: ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ﴾[محمد ١٣] دوسری آیت میں مکہ مکرمہ کو ''بستیوں کا مرکز'' فرمایا گیا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا﴾[الشوریٰ ٧]

زیر تفسیر آیت میں ﴿هٰذِهِ الْقَرْيَةَ﴾ کے مفہوم میں مفسرین کا اختلاف ہے:

(١) جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے مراد ''بیت المقدس'' ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے ﴿يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾[المائدة ٢١] اور حضرت قتادہؒ وغیرہ سے یہی تفسیر صحیح سند سے ثابت ہے۔

(٢) بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد شہر ''اریحا'' ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس قول کو بعید کہہ کر مسترد کیا ہے، کیونکہ ''اریحا'' ان کے راستے میں نہیں تھا اور وہ بیت المقدس جا رہے تھے۔

(٣) بعض نے اس سے ''مصر'' مراد لیا ہے۔ ابن کثیرؒ نے اس قول کو پہلے قول سے بھی بعید تر قرار دیا ہے۔

(٤) بعض نے اس سے ''شام'' مراد لیا ہے۔ اس میں اور بھی اقوال ہیں۔

﴿فَكُلُوْا مِنْهَا﴾ میں کھانے کا حکم اباحت کے معنی میں ہے، یعنی ہم نے تمہارے لیے اس میں کھانے کو حلال کر دیا ہے۔ ﴿حَيْثُ شِئْتُمْ﴾ میں ﴿حَيْثُ﴾ ظرف مبنی علی الضمّ ہے۔ اس میں اور بھی لغات ہیں۔ ﴿رَغَدًا﴾ رَغِدَ و رَغُدَ عيشُهُ رَغْدًا و رَغَدًا سے مصدر ہے۔ اور یہ محذوف کی صفت مشبہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ تقدیر

کلام ہے: "اَکلاً رَغَدًا" اس کی تفسیر میں سلفؒ کے مختلف اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ بغیر کسی فکر اور حساب کے، اور بغیر کسی تکلیف اور پریشانی کے انتہائی سہولت اور وسعت کے ساتھ ملنے والا معاش۔

﴿وادخلوا البابَ سجّدًا﴾ بعض مفسرین کے نزدیک بیت المقدس کا کوئی بھی دروازہ مراد ہے۔ امام بغویؒ فرماتے ہیں: بیت المقدس کے سات دروازے تھے۔ بعض کے بقول ایک مخصوص دروازہ مراد ہے، جو "بابُ الحِطّةِ" کے نام سے معروف ہے۔ ﴿سجدًا﴾ ادخلوا کے واو سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی تم سجدے کی حالت میں داخل ہو جاؤ۔ "سجدہ" عربی زبان میں خشوع، خضوع اور عاجزی کا نام ہے۔ ظاہری طور پر اس کی نمایاں ترین شکل پیشانی خاک پر رکھنا ہے۔ [دیکھ: التراث ۲۰/۶] بنی اسرائیل کو "سجدے کی حالت میں" شہر میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا۔ اس "سجدے" سے کیا مراد ہے؟ مفسرین کی آراء مختلف ہیں:

اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ حقیقی سجدہ کی حالت میں داخل ہونا ممکن نہیں، لہٰذا انہوں نے مختلف توجیہات بیان کی ہیں:

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہیں کسی چھوٹے دروازے سے رکوع کی حالت میں، یعنی سر جھکا کر داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور عربی زبان میں تعظیم کی خاطر جھکنے والے کو "ساجد" کہا جاتا ہے۔ امام طبریؒ نے صرف یہی قول نقل کیا ہے۔ (۲) عاجزی، انکساری اور تواضع کے انداز میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیخ سعدیؒ نے اسے ترجیح دی ہے۔ (۳) بعض علماء نے اس سے "حقیقی سجدہ" ہی مراد لیا ہے۔ یعنی انہیں شہر کے اندر داخل ہوتے ہی شکر بجالاتے ہوئے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ شیخ ابن العثیمینؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ واللہ اعلم

﴿وقولوا حِطّةٌ﴾ حِطّة مشہور قرأت کے مطابق مبتدا محذوف کا خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، یعنی: مسئلتُنا حِطّةٌ یا حاجتُنا حِطّةٌ. یا حکایت کی وجہ سے مرفوع ہے۔ ایک اور قرأت ﴿حِطّةً﴾ ہے۔ یہ قولوا کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یا "مصدر" اگر اپنے فعل کی جگہ استعمال ہو تو منصوب ہوتا ہے، جیسا کہ سمعًا، طاعةً. اور ﴿حِطّةً﴾ بھی احْطُط کا مصدر ہے، جیسا کہ رَدَدتُ اور مَدَدتُ سے مصدر رِدَّةٌ، مُدَّةٌ آتا ہے۔

﴿حِطّةٌ﴾ کے معنی میں سلفؒ سے مختلف روایات منقول ہیں: (۱) ﴿احطط عنا ذنوبَنا یا حُطَّ عنا خطایانا یعنی: "ہمارے گناہ جھاڑ دے۔" یعنی: اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگو۔ یا اس کے معنی مغفرةٌ ہیں یا "توبہ" مراد ہے، جیسے ایک شاعر نے کہا:

فازَ بالحِطّةِ التی صیَّر اللّٰـ ـهُ بها ذنبَ عبدِهِ مغفورًا

یہی قول راجح اور زیادہ واضح ہے۔

(۲) ﴿حِطَّةٌ﴾ بمعنی لا اِلٰہ اِلا اللّٰہُ یعنی تم یہ کلمہ پڑھو، تمہارے گناہ معاف کردیے جائیں گے۔ لیکن اس قول کے لیے بظاہر کوئی صریح دلیل نہیں ہے۔ (۳) بعض کے بقول ﴿حِطَّةٌ﴾ ایک تعبُّدی کلمہ ہے، اس کے معنی معلوم نہیں۔

﴿نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ﴾ یہ جملہ سابقہ امر ﴿وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾ کا جواب ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ یعنی: اگر تم ہمارے حکم کو مان کر عمل پیرا ہوں تو ہم تمہارے گناہ معاف فرمائیں گے۔ مشہور قرأت میں یہ جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ دوسری قرأت ہے: ﴿تُغْفَرْ﴾ اس کا نائب فاعل ﴿خطایاکم﴾ ہے۔ تیسری قرأت ہے: ﴿يُغْفَرْ﴾ فعل اور نائب فاعل کے درمیان فاصلہ آنے کی وجہ سے مذکر کا صیغہ آنا بھی لغتِ عرب میں جائز ہے۔

غُفران کے معنی ہیں: پردہ ڈالنا اور چھپالینا۔ اسی چھپانے کے مفہوم کی وجہ سے ''خود'' کو المِغفَر کہتے ہیں۔ نیز کہا جاتا ہے: الصبغُ أغفَرُ لِلوَسَخِ یعنی رنگنے سے میل کچیل چھپ جاتا ہے۔ اسی سے درگزر کرنے کو المغفرة کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں سے کبھی گناہ سرزد ہوتا ہے، تو اپنے فضل سے اس پر دنیا میں پردہ ڈال دیتا ہے اور آخرت کے دن اس کو معاف فرماتا ہے۔ جیسا کہ حدیث نبوی میں ہے: ''قد سترتُها علیکَ فی الدنیا وأنا أغفرها لکَ الیومَ'' [صحیح البخاری ح:۷۰۱۵] ''میں نے تجھ پر دنیا میں پردہ ڈال دیا اور آج میں تیرے لیے درگزر بھی فرماؤں گا۔''

﴿خَطَايَا﴾ خَطِيْئَةٌ کی جمع ہے۔ اور یہ ایسے گناہ کو کہا جاتا ہے، جسے انسان جان بوجھ کر انجام دیتا ہے۔ اگر انسان کی نیت کے بغیر سرزد ہو، تو اسے ''إخطاء'' کہا جاتا ہے۔ اسی سے خطیئة کے فاعل ''خَاطِئ'' اور إخطاء کے فاعل ''مُخْطِئ'' کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔ پہلے پر ملامت کی جائے گی اور وہ سزا کا مستحق ہوگا، جیسے فرمانِ الٰہی ہے: ﴿لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ○ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ○﴾ [العلق ۱۵-۱۶] جبکہ ''مُخطِئ'' کو معذور سمجھا جاتا ہے۔ ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ [البقرة ۲۸۶]

﴿وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ سَ کے معنی ہیں: عنقریب۔ یعنی ہم جلد ہی خطا کاروں کے گناہ معاف فرمائیں گے اور نیکوکاروں کو مزید نعمتوں سے نوازیں گے۔ ﴿المحسنین﴾ سے مراد بنی اسرائیل کے تابعدار لوگ ہیں، جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی اطاعت میں بچھڑا پرستی اور دیگر بدعات اور معاصی سے اجتناب کیا۔ حافظ قرطبیؒ کہتے ہیں: محسِن اسے کہتے ہیں جو عقیدہ توحید میں پختہ اور اپنے معاملات میں کھرا ہو، فرض اعمال کی پابندی کرے اور معاشرہ اس کے ہاتھ اور زبان وغیرہ کے شر سے محفوظ ہو۔ ''احسان'' کی دو قسمیں ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مکمل خلوص اور یکسوئی، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "أن تعبد اللہ کأنک تراہ، فإن لم تکن تراہ فإنہ یراک" [صحیح مسلم ح:۹۳] "تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، اگر تو اللہ کو دیکھ نہیں رہے ہو، تو اللہ یقیناً تجھے دیکھ رہا ہے۔"

(۲) اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ معاملات میں بھلائی کرنا، یعنی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور انہیں کسی قسم کی جسمانی، نفسیاتی یا مالی تکلیف نہ پہنچانا۔

﴿فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلاً غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَھُمْ﴾ بَدَّلَ یُبَدِّلُ تَبْدِیْلاً کے معنی ہیں: بدل دینا۔ یعنی ان ظالموں نے فرمانِ الٰہی کی مخالفت اور اس کے رسول علیہ السلام سے مذاق کرتے ہوئے من مانی کی۔ یہاں سیاق کلام کا تقاضا تھا کہ فاعل ضمیر لائی جاتی، مثلاً فبدلوا قولاً؛ لیکن یہاں فاعل اسم ظاہر لایا گیا، تاکہ ان کے کرتوت کا حکم بھی واضح ہو۔ اسی سے ان لوگوں کی شرعی حیثیت بھی اجاگر ہوتی ہے، جو اللہ پاک اور اس کے رسولوں کے فرامین کو جوں کا توں مان کر سرِ تسلیم خم کرنے کے بجائے عقل کے گھوڑے دوڑائیں یا کسی بدنیتی کی بنیاد پر من پسند تاویلیں کریں۔ نیز اسی انداز کلام میں مخاطب کی تنبیہ بھی مطلوب ہے؛ کیونکہ جب کلام اپنے سیاق سے ہٹ کر کیا جائے تو مخاطب متنبہ ہو جاتا ہے۔

آیت مبارکہ میں جس "بات" کو تبدیل کرنے پر ان کی ملامت کی گئی ہے، اس بارے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "جب بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ، تو سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہو گئے۔ اور ﴿حِطَّةٌ﴾ کے بجائے حَبَّةٌ فی شَعْرَةٍ "دانہ بالی میں" کہا۔ [صحیح البخاری ۴۶۴۱] بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے ﴿حِطَّةٌ﴾ کے بجائے حِنْطَةٌ یعنی "گندم" کہا۔ [المستدرک ۲/۲۶۲، الطبری] اور امام طبریؒ کی ایک روایت کے مطابق وہ سر اٹھا کر سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے۔

﴿فَاَنْزَلْنَا عَلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا﴾ میں فاء سبب کے معنی میں ہے، یعنی اس تبدیلی کی وجہ سے ہم نے ان ظالموں پر عذاب نازل کیا۔ ان کے جرم کی سنگینی اور فعل بد کی شدت قباحت کو واضح کرنے کے لیے فانزلنا علیھم کے بجائے علی الذین ظلموا فرما کر ضمیر کی جگہ اسم ظاہر لایا گیا۔ "ظلم" کسی چیز کو مناسب جگہ سے ہٹانے کو کہا جاتا ہے۔

﴿رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ مشہور قرأت ﴿رِجز﴾ ہے، ایک اور قرأت میں ﴿رُجز﴾ ہے۔ اس آیت میں ﴿رِجز﴾ کے معنی ہیں: عذاب۔ اور آخر میں "ز" کی جگہ "س" آئے تو ﴿رِجس﴾ کے معنی ہیں گندگی اور پلیدی، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ﴿فَزَادَتْھُمْ رِجْسًا اِلٰی رِجْسِھِمْ﴾ میں آیا ہے۔ بعض علمائے لغت کے نزدیک ﴿رِجس﴾ بھی